عصر حاضر میں اُردو افسانے کے بدلتے رجحانات

ڈاکٹر محمد اعجاز تبسم
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو
لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

CHANGING TRENDS IN CONTEMPORARY URDU FICTION

Ijaz Tabussum, PhD
Assistant Professor of Urdu
Lahore Garrison University, Lahore

Abstract

Urdu fiction is proving to be helpful in developing a new global consciousness. It has attained the height of artistic maturity owing to the employment of symbolism. The Urdu fiction has the full potential to portray cultural chaos, decaying morality, sexual perversion, instability, aggression, terrorism, issues related to family life, apathy, selfishness, egoism, snobbery, disappearance of middle classes, social and political interests, loneliness, psychological disturbances, soulless life, a sense of exile, self-made religious beliefs etc. Specimens from different short stories have been incorporated in the article to show the changing trends in contemporary Urdu fiction.

Keywords:

بانو قدسیہ، اشفاق احمد، اُردو، افسانہ، تحریکِ آزادی کشمیر، عراق، افغانستان

عصرِ حاضر میں اُردو افسانہ بدلتے ہوئے تہذیبی و سماجی رجحانات کے پیش نظر اپنے ارتقائی مراحل طے کر کے اک نئے عالمی شعور کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ فنی پختگی کا یہ عروج اسے سماج اور زندگی کی قربت سے عطا ہوا۔ اس نے تہذیب و مذہب اور دیگر سماجی اقدار کے مجروح ہونے کے خیال سے علامتی انداز اپنایا اور یہ سفر اس کی مقبول ترین منزل ثابت ہوا۔ یہ علامتی جہات گذشتہ صدی کے جن افسانہ نگاروں نے متعارف کروائیں ان میں سے بعض کا انتقال بیسویں صدی میں ہی ہو گیا تھا اور بعض کا انتقال اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں ہوا۔ پچھلی ایک صدی کے نمایندہ افسانہ نگار، جنھوں نے سماجی اقدار کی تنزلی، انسان کی جنسی بے راہ روی، اخلاقی اقدار کی پامالی اور دیگر مسائلِ زمانہ کو موضوعِ بحث بنایا، وہ یقیناً داد و تحسین کے مستحق ہیں، جن کی کاوشوں سے اُردو افسانے کو یہ مقام نصیب ہوا۔ ان میں بالخصوص پریم چند (۱۸۸۰۔۱۹۳۶ء)، سلطان حیدر جوش (۱۸۸۶۔۱۹۵۴ء)، یلدرم (۱۸۸۰۔۱۹۴۶ء)، منٹو (۱۹۱۲۔۱۹۵۵ء)، عصمت چغتائی (۱۹۱۵۔۱۹۹۱ء)، انور سجاد (۱۹۳۵۔۲۰۱۹ء)، انتظار حسین (۱۹۲۵۔۲۰۱۶ء)، خدیجہ مستور (۱۹۲۸۔۱۹۸۲ء)، بانو قدسیہ (۱۹۲۸۔۲۰۱۷ء)، اشفاق احمد (۱۹۲۵۔۲۰۰۵ء)، قدرت اللہ شہاب (۱۹۱۷۔۱۹۸۶ء)، احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶۔۲۰۰۶ء)، عبداللہ حسین (۱۹۳۱۔۲۰۱۵ء)، قرۃ العین حیدر (۱۹۲۶۔۲۰۰۷ء)، رحمان مذنب (۱۹۱۵۔۲۰۰۰ء)، ممتاز مفتی (۱۹۰۵۔۱۹۹۵ء)، بلونت سنگھ (۱۹۲۱۔۱۹۸۶ء)، راجندر سنگھ بیدی (۱۹۱۵۔۱۹۸۴ء)، کرشن چندر (۱۹۱۴۔۱۹۷۷ء)، انیس ناگی (۱۹۳۹۔۲۰۱۰ء)، غلام عباس (۱۹۰۹۔۱۹۸۲ء)، جوگندر پال (۱۹۲۵۔۲۰۱۶ء) اور رام لعل (۱۹۲۳۔۱۹۹۶ء) قابلِ ذکر ہیں۔

عصرِ حاضر میں اُردو افسانہ اپنی جدت، موضوعات کے متنوع اسلوب اور تکنیک کی بنا پر اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ اس نے اپنا تہذیبی رشتہ نہ صرف اپنے ماضی سے برقرار رکھا ہے بل کہ اپنے خارجی ماحول اور انسان کے باطن میں جھانک کر، سماجی حالات کی تلخیوں، حالاتِ حاضرہ اور انسانی رویوں میں ممکنہ تبدیلیوں کو بھی اپنے مخصوص بیانیے کا حصہ بنایا ہے جس کی بنا پر اس صنفِ ادب میں وسعت و ہمہ گیری نے جنم لیا ہے۔ ڈاکٹر سید زبیر شاہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آج کا افسانہ صرف خارجی ماحول سے آشنا ہی نہیں بل کہ انسان کے باطن سے بھی آگاہ دکھائی دیتا ہے۔ حالات کی کش مکش، واقعات کی تلخیوں اور

گوناگوں تبدیلیوں نے جدید افسانے کو مختلف موضوعات کے علاوہ کئی تکنیک، اسلوب اور بیانیے بخش دیے ہیں جس سے افسانے کا کینوس وسیع تر ہو چکا ہے۔(۱)

عصر حاضر میں رضیہ فصیح احمد (۱۹۳۴ء)، طاہر نقوی (۱۹۴۲ء)، عذرا نقوی (۱۹۵۲ء)، مہتاب عالم پرویز (۱۹۶۶ء)، اشتیاق سعید (۱۹۶۴ء)، حمید شاہد (۱۹۵۷ء)، منشا یاد (۱۹۳۷۔۲۰۱۱ء)، عالم خاں (۱۹۴۸ء)، نیر مسعود (۱۹۳۶۔۲۰۱۷ء)، امجد طفیل (سن ندارد)، زاہدہ حنا (۱۹۴۶ء)، شاہین کاظمی (سنہ ندارد) اور دیگر افسانہ نگاروں نے اُردو افسانے کے بدلتے رجحانات کے پیش نظر خود آگہی اور تہذیبی ورثہ کی کھوج کو اپنا فرض اولین قرار دیا ہے۔

رضیہ فصیح احمد ''ہنسی کی بات'' میں عصر حاضر کے اخلاقی زوال کو بڑی مہارت سے موضوع بحث بناتی ہیں جس میں مغرب کی کھوکھلی اقدار کو دکھانے کے لیے ''مائیکل اور آرلین'' دو مرکزی کرداروں کا سہارا لیا گیا ہے۔

طاہر نقوی کی کہانی ''فاریسٹ آفیسر'' بھی عصر حاضر میں تغیر پذیر سماج کی بے سمت زندگی اور انسان کی نفسیاتی الجھنوں کو بہ خوبی ظاہر کرتی ہے۔ زندگی کے جنگل میں بھٹکنے کے بعد واپسی کا رستہ مشکل سے ہی ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانے ''بند لبوں کی چیخ'' میں اکیسویں صدی کے انسان کی معاشی مجبوریوں، اس کے ذہن و جذبات کی کش مکش اور زوال آمادہ اخلاقی قدروں کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل عصر حاضر انسان میں شرافت کا لبادہ اوڑھے منتشر خیالات کی کہر میں ڈوبا ماضی کے لمحات کا پچھتاوا اپنی چشمِ بے نور میں سجائے دُکھوں کی دَل دَل میں پھنس چکا ہے۔ اس عہد میں سماجی کرب، معاشی مجبوریاں اور تہذیبی قدریں انتہائی سرعت کے ساتھ اپنا چولا بدل رہی ہیں۔ موجودہ انسان کو مذہبی انتہا پسندی اور سماجی دہشت گردی نے اخلاقی گراوٹ کا شکار کر دیا ہے لیکن وہ اپنی ذمہ داریاں عزم صمیم کے ساتھ نبھانے کے لیے پھر بھی تیار ہے:

> ذہن و جذبات کی کش مکش سے اسے نجات کسی صورت نہیں مل رہی تھی اسے اپنی ماں اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال آتا تو وہ کانپ کر رہ جاتا اور زندگی کی یہ مجبوریاں اس کے ہونٹوں پر شرافت کا ہاتھ رکھ دیتیں، ارادے کی دھوپ اب منتشر خیالات کی کہر میں ڈوب گئی تھی۔ شیشے کا گھر حالات کے پتھروں سے چکنا چور ہو جانے کے خیال

سے وہ لرز اٹھا۔ پچھلے لمحات اور واقعات پچھتاوے بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے جنھوں نے نشتر بن کر اس کی زندگی میں جنم لیا تھا۔ وہ ان سے اب دامن نہیں بچا سکتا تھا اور نہ آنکھیں ملا سکتا تھا۔(۲)

اس افسانے میں انسان کے اندر احساسِ ذمہ داری کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ وہ انسانی قدروں کو بھول کر دولت کا پجاری بن گیا ہے۔ اب عہد حاضر کے انسان کو معاشی بحران اور سرپر غربت کے اُگے ببول کی چبھن کا احساس، دل و دماغ کو ریزہ ریزہ کرتی حسرتیں، غریبی و امیری کا موازنہ اور روپے پیسے کی غیر منصفانہ تقسیم اک پچھتاوا بن کر سانپ کی طرح ڈس رہی ہے۔ دراصل زندگی کے آلام اور اس کے بدلتے تقاضوں کا سامنا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہیں۔ انسان کی حسرتوں کا اصل مرکز و محور اس کے فطری جذبات واحساسات اور اس سے منسلک رشتے ہیں۔ وہ عزم وہمت کا کوہ سار بن کر کہیں انھیں نبھاتا اور کہیں ان سے آنکھیں چراتا نظر آتا ہے۔ ''بدلتے لمحوں کا دکھ'' اس افسانے میں طاہر نقوی نے امارت اور غربت میں بنیادی فرق واضح کر کے نام نہاد انسانیت کو جھنجھوڑا ہے:

> اس نے محسوس کیا جیسے وہ کوڑا کرکٹ ہو اور کوڑے کے ڈھیر میں پڑا ہو۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر ماتھے سے خون کی بوندیں آنکھوں اور ناک تک آگئیں ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک خوش لباس آدمی نے کار سے اُتر کر اسے سہارا دیا جیسے ردی کاغذ پھینکنے والے کو احساس ہو جائے کہ کہیں کام کا کاغذ تو نہیں پھینک دیا اس لیے دوبارا اسے اٹھا کر دیکھے اور بیکار ہی نکلنے پر پھر ایک طرف ڈال دے۔ جیب سے پانچ کا نوٹ اسے تھماتے ہوئے بولا:
> ''یہ لو مرہم پٹی کرا لینا۔'' اس نے غصے سے ہتھیلی پر رکھے ہوئے نوٹ کو دیکھا جیسے یہ غربت کا سانپ ہو جس کا زہر اس کے بچوں کی اور اس کی بیوی کی زندگیوں میں پہلے ہی پھیل چکا تھا۔
> غربت کا احساس ذہن و دل دونوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر جائے اس کی ٹائی پکڑ کر جھٹکا دے اور یہ نوٹ اس کے منہ پر دے مارے۔(۳)

درج بالا افسانہ ہمارے زوال پذیر سماج کے اس بالادست طبقے کی ہٹ دھرمی اور متوسط و تباہ حال طبقات کے جذبات کا نوحہ ہے جو ساری عمر غربت کی شال اوڑھے سسک سسک کر گزارا کرتے

ہیں۔ ان کی آرزوئیں اور دکھ بھری آہیں اندر ہی اندر دم توڑتی رہتی ہیں۔ عصر حاضر کے انسان کا اخلاقی و معاشی زوال نہ صرف اس کے سماج پر اثر انداز ہو رہا ہے بل کہ زمانۂ استقبال کی تباہ حالی کی پیشین گوئی بھی کر رہا ہے۔ موجودہ انسان صرف دولت کا بھوکا ہے اس کے اندر کا باوقار اور پُر خلوص انسان موجودہ صدی میں بڑی تیزی سے معدوم ہو رہا ہے۔ وہ سماجی اقدار اور تہذیب و شائستگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی خودی و خودداری کی موت خود مر رہا ہے۔

عذرا نقوی نے اپنے افسانوں میں نہایت نازک خیالی اور فنی مہارت سے اکیسویں صدی کے سماج کی الجھنوں اور متغیر ہوتی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ وہ انسان کے دامن سے وابستہ حسرتوں اور اداس لمحوں کی افسانہ نگار ہیں، حقائق زمانہ سے آنکھ نہیں چراتیں بل کہ کئی عیوب و معاملات کو اپنے افسانوں میں سوز و گداز کے ساتھ پیش کرنے کی مہارت رکھتی ہیں۔ انھوں نے کہیں کہیں تہذیبی بگاڑ اور سماجی رویوں کے المیاتی تاثر کو بھی پیش کیا ہے۔ عصر حاضر میں انسان کا اخلاقی زوال اور مرتے ہوئے تہذیبی رویے ان کے افسانوں میں ایک دردناک چبھن بن کر اُبھرتے نظر آتے ہیں۔ اس نے روحانی زندگی سے خود کو برطرف کر کے مادیت پرستی میں کس حد تک اپنے آپ کو مدغم کر لیا ہے۔

عذرا نقوی اپنے افسانوی مجموعے **آنگن جب پردیس ہوا** میں مشمولہ کہانی ''الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے'' میں اکیسویں صدی کے انسان کی نت نئی مصروفیات، ظاہری اور داخلی صورت کے رجحانات، شخصیاتی تضادات، درس گاہوں میں اس کی کردار کشی، اخلاقی زوال، عبادت گاہوں میں ریاکاری کے مناظر، مذہبی تقدس کی پامالی، جنسی ہوس، انسان کے ہاتھوں قربان ہوتی اخلاقی اقدار و روایات اور عصری حسیت کو بہ طریق احسن اپنی افسانوی تخلیقات کا حصہ بناتی ہیں، جس میں انھوں نے سماج کو طنز کے نشتر سے الفاظ کا روپ دیا ہے:

> ''گاڑی کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ہماری گاڑی سے ٹیک لگائے ایک نوجوان جوڑا دنیا سے بے خبر، ایک دوسرے میں کھویا ہوا کس (Kiss) کر رہا تھا۔ ہماری آہٹ سن کر دونوں نے سر اٹھایا۔ لڑکے نے انگریزی میں کہا: ''کتنی خوب صورت رات ہے''۔(۴)

''بیک ڈور'' مہتاب عالم پرویز کا بہت عمدہ افسانہ ہے اس میں دورِ حاضر کے انسان کے اخلاقی زوال، سماجی مسائل اور نفسانی خلفشار کو نہایت عمدگی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا گیا ہے۔ اکیسویں صدی

کے سماج کا گھناؤنا چہرہ ایک حور کا سا نقاب اوڑھے عصر حاضر کے انسان کو اپنا گرویدہ بنا رہا ہے، اس صورت میں جنسی بھوک اور تنہائی کا کرب اسے اپنے لاشعور کے نادیدہ جزیروں کی جانب دھکیل رہا ہے جس سے اس کی روحانی زندگی متاثر ہوئی ہے۔ یہ جنگ وہ وہ اپنے آپ سے پچھلے کئی برسوں سے لڑ رہا ہے لیکن جیت ہر دفعہ اس کے اندر چھپے ان دیکھے خوف کی ہوتی ہے۔ انسان ساری زندگی کرب سہتا اور کرب سے گزرتا ہے مگر کہیں کہیں تاریک راہوں میں اجلا سویرا بن کر امید کے لمحات اسے تھام لیتے ہیں۔ اس نے اس جسدِ خاکی میں ارمانوں کے کئی محل تعمیر کر رکھے ہیں جن کی سراب انگیز ساعتیں اس کے لیے تکلیف دہ ہیں مگر ان تصوراتی محلات کا بھیانک چہرہ اس کی زندگی کے اندر جلتے آرزوؤں کے الاؤ کو دھندلا کر رہا ہے:

> مجھے معاف کر دو میرے بھائی، کبھی کبھی انسان آرزوؤں کے چہروں کے ان گنت محل تعمیر کرتا ہے مگر مجبوریاں اس کے تعمیر کردہ ان تصوراتی محلوں کو پلک جھپکتے ہی زمین بوس کر دیتی ہیں۔ میری دلی خواہش تھی کہ اپنے بھائی کی شادی میں اپنے ہاتھوں سے سہرا باندھوں گا لیکن انسان کی ہر خواہش تکمیل تک نہیں پہنچ پاتی۔ ہر خواب کی تعبیر نہیں ہوتی— (۵)

اشتیاق سعید کی کہانی ''بعید از قیاس تسکین'' میں عصر حاضر کے سماج کی حقیقی زندگی کا صحیح رُخ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ ایک شادی شدہ عورت، جواں سالہ دو کنواری بیٹیاں ہونے کے باوجود سماج کے منہ پر کلنک کا ٹیکا ہے۔ اسے اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں اپنی اولاد کی تربیت اور اپنی عزت کا خیال رکھنا چاہیے تھا مگر وہ جنسی بے راہ روی کا شکار ہو چکی ہے۔ وہ پیٹھ پیچھے اس کی عزت کو تار تار کر کے اک ایسی اس دَل دَل میں دھنس چکی ہے جس سے اب نکلنا ناممکن ہے۔ حاضر غائب میں لکھی گئی یہ کہانی ہمارے ہی سماج کی کرب ناک تلخیوں اور زوالِ تہذیب کو اُجاگر کرتی ہے۔

ایک کفن اور اشتیاق سعید کا یہ افسانہ پریم چند کے **کفن** کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ مصنف نے بڑی مہارت سے انسان کے باطنی اور خارجی تضاد کو پیش کیا ہے۔ اس افسانے کے کردار بھی مادھو گھیسو اور بدھیا ہیں۔ دراصل موجودہ انسانی تہذیب پر وحشت و بربریت کا بھوت سوار ہے۔ اس کی بے حسی

نے اس کے روحانی تقدس کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ گھیسو، مادھو اور بدھیا اس زوال آمادہ سماج کے بے حس کردار ہیں۔ دیکھا جائے تو بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کے سماج میں کچھ خاص فرق دکھائی نہیں دیتا ہے۔ منشی پریم چند نے چوراسی سال پہلے اس کا نقشہ کھینچا تھا اور اب اشتیاق سعید بھی اسی کے طرف دار نظر آتے ہیں۔ انسان نے اس دانش و حکمت اور ترقی کے باوجود اپنے تہذیبی و سماجی رویوں کو نہیں بدلا بل کہ وہ اپنے اصل منصب سے گرتا ہی دکھائی دیتا ہے۔

اس افسانے میں نہایت خوب صورت علائم و رموز کے ساتھ ابتدا میں ہی منظر کشی اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ رات کی کوکھ سے صبح کا جنم، کہر آلود فضا، کھڑنجے کی سڑک، خمار کا فور ہونا جیسے الفاظ اور انسان کی بے حسی اکیسویں صدی کے بے حس، نامراد اور خون آشام سماج کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے:

> رات کی کوکھ سے صبح کا جنم ہوا ساتھ ہی مادھو کا خمار بھی ٹوٹا۔ اس نے کروٹ بدلی کہ یکایک جسم کو چھید دینے والی ہوا کا ایک جھونکا اس پر کپکپی طاری کر گیا۔ وہ کسمسا کے اٹھ بیٹھا اور خود کو یوں کہر آلود فضا میں گم کھڑنجے کی سڑک پر پڑا پا کے استعجابیہ نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ دیکھا چند گز کے فاصلے پر اس کا باپ بھی گھٹنوں کو پیٹ سے لگائے بے سدھ پڑا ہے اور ایک کتا ٹانگ اٹھائے اس کے منہ پر موت رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی اس کا رہا سہا خمار بھی کافور ہو گیا اور وہ بیٹھے بیٹھے ہانکنے والے انداز میں کتے کی جانب ہاتھ لہراتے ہوئے ڈانٹنے لگا۔(۶)

اشتیاق سعید نے موجودہ انسان کے تہذیبی بحران، معاشی بدحالی، اخلاقی زوال اور جنسی بے راہ روی کو بہ طریق احسن اپنی کہانیوں میں سمویا ہے، کہیں بھی منفی تاثر نہیں اُبھرتا۔ وہ تہذیبی و سماجی رویوں میں تغیر، سسکتی اور کرب میں مبتلا زندگی کے منظر نامہ کی تصویر کشی بہترین انداز میں کرتے ہیں۔

''بہ رضائے صنم'' میں بھی عصر حاضر کے ایک نوجوان کی جنسی بے راہ روی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ رگ رگ میں شراب و شباب کا سما جانا، دل مضطرب ہونا، حلق میں چبھن ہونا اور روح میں بے چینی بھرنے لگنا یہ ایسی کیفیات ہیں جو انسان کو کسی کی زلفوں کا اسیر بتاتی ہیں۔ اس میں ایک نوجوان ریشماں نامی عورت کے جسم کا خواہش مند ہوتا ہے۔ وہ دن بھر اپنے روزگار میں تو الجھا رہتا ہے مگر اسے

داخلی و دلی تسکین اس کے وصال سے ہی میسر ہوتی ہے۔ اشتیاق سعید نے بلامبالغہ اکیسویں صدی کے سماج کی عصری معنویت کو الفاظ کا روپ دے کر عہدِ حاضر کی نوجوان نسل کی بے روح زندگی اور غیر اخلاقی رویوں سے پردہ اُٹھایا ہے:

> پھر تو میں باقاعدہ طور پر ریشماں کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہنے لگا تھا۔ دن بھر اپنے روزگار میں الجھا رہتا لیکن شام ہوتے ہی میرے اندرون میں ایک طرح کی کش مکش جاری ہو جاتی، دل مضطرب ہو جاتا، حلق میں چبھن سی ہونے لگتی۔ لبوں میں جنبش در آتی، جسم کسی گداز، جسم کا تعارف چاہنے لگتا۔ غرض کہ چند ہی دنوں میں میرا رگ رگ شراب و شباب کا عادی ہو گیا تھا۔ (۷)

مذکورہ بالا افسانے کے اس اقتباس سے واضح ہے کہ اشتیاق سعید نے دبے الفاظ میں انسان کے اخلاقی و روحانی زوال کو اپنی کہانی کا حصہ بنایا ہے۔ ماضی میں اس کے تہذیبی رویے، سماجی تقاضے اور زندگی کا حسن موجودہ انسان کی زوال آمادہ تہذیب کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو عصر حاضر کے اُردو افسانے میں اخلاقی زوال کی نوحہ گری، جنسی بے راہ روی، جسمانی لذت کوشی، سماجی رویوں کا تغیر، شخصی تضاد، ریاکاری اور مذہبی تقدس کے نام پر قربان ہوتی اشرافیہ اس کے غالب موضوعات ہیں۔

زاہدہ حنا اور شاہین کاظمی نے اپنے افسانوں میں عائلی زندگی، دہشت گردی، تانیثی فکر و فلسفہ، سرمایہ داری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات جیسے مباحث کو شامل کر کے اسے اور بھی معنی خیز بنا دیا ہے۔ ارمانوں کی آگ میں سلگتی زندگی، سماجی اقدار اور تہذیبی رعنائیوں سے دور ہوتے قلوب جہاں مادیت پرستی کا خول اپنے چہرے پر چڑھائے بے حس انسانیت سے نبرد آزما دکھائی دے رہے ہیں، وہاں دربہ دری کا احساس اور جنسی بھوک بھی اک کرب کی صورت میں اپنا عکس دکھا رہی ہے۔ عصر حاضر میں لمحہ بہ لمحہ واقعاتِ زمانہ اور مختلف تبدیلیوں سے ہم کنار ہوتی زندگی جدید اُردو افسانے کا موضوع بنی۔ بہ ہر کیف اس میں سماجی و مذہبی موضوعات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر پھیلنے والی بدامنی، جنگ و جدل کے نہ ختم ہونے والے سلسلے، افغانستان میں سسکتی بلکتی زندگی کے مناظر، مسلم ممالک پر روس اور

امریکی جارحیت، نائن الیون اور دہشت گردی، تحریکِ آزادی کشمیر، تحریکِ آزادی فلسطین اور عراق پر امریکی مظالم کی اندوہ ناک داستان رقم ملتی ہے:

> زاہد حنا نے فلسطینی مسلمانوں پر یہودیوں کے ڈھائے جانے والے ظلم و ستم، تحریکِ آزادی کشمیر، افغانستان پر روسی و امریکی جارحیت اور اس کے باعث چھڑنے والی جنگ، ان کی پاکستان ہجرت نائن الیون کے ردِ عمل میں پھیلنے والی دہشت گردی اور دیگر واقعات و مسائل زمانہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔(۸)

تقسیمِ ہند کے دوران پیدا ہونے والی تہذیبی و سماجی صورت حال نے اُردو ادب کو بے حد متاثر کیا چناں چہ منٹو، بلونت سنگھ، کرشن چندر، بیدی، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں نے ہجرت کے اس کرب کو نہ صرف محسوس کیا بل کہ اسے شعوری طور پر اپنی تخلیقات کا حصہ بھی بنایا۔ زاہدہ حنا کے کئی افسانے اسی تہذیبی روایات کا تسلسل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اردو کے افسانوی ادب کی روایت سے جڑی ہوئی افسانہ نگار ہیں۔ بالخصوص انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کا افسانوی رنگ ان کے اسلوب کا حصہ دکھائی دیتا ہے۔ طارق چھتاری کا کہنا ہے:

> اُن کے افسانے انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کے فن کی آمیزش معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں تقسیمِ ہند کا کرب بھی موجود ہے اور بے ذہنی کا احساس بھی۔(۹)

سماج میں ہجرت کے اسی کرب اور بے ذہنی کے احساس نے انھیں اپنی سرزمین کے ساتھ جڑے رہنے پر آمادہ کیا ہے۔ اس سرزمین اور دھرتی کی کوکھ سے جنم لینے والے دکھوں، اس پر ہونے والے ظلم و ستم اور ناانصافی کو دیکھ کر ان کا دل کڑھتا ہے۔ اسی اندوہ ناک صورت حال کی وجہ سے ان کے قلم کی دھار سے الفاظ بہتے لہو کی مانند نکلتے ہیں۔ انھوں نے جن افسانوی مباحث کو چھیڑا ہے وہ عالمی سطح پر پھیلے سماجی مسائل اور دیگر عصری رجحانات کے عکاس نظر آتے ہیں۔ عصر حاضر میں دندناتی بے حس اشرافیہ جس نے نام نہاد مذہب کی آڑ میں نسل انسانیت کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ اس سرزمین کا بیشتر حصہ جنگ کی لپیٹ میں ہے جہاں روتی بلکتی، سسکتی، اپنوں سے بچھڑتی اور تنہائی کا دُکھ سہتی انسانیت اک سوالیہ نشان بن کر زاہدہ حنا ان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑتی نظر آتی ہے۔ اسی بنا پر احمد عقیل روبی نے زاہدہ حنا کو اُردو کے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں شمار کیا ہے۔(۱۰)

آفاقی شہرت کے حامل افسانہ نگاروں نے اپنے تہذیب و سماجی شعور کے پیش نظر سچ کی تلاش، جدوجہد آزادی، مظلوم کی دادرسی، ستم گر سے نفرت کا اظہار، حقوق انسانی کے لیے تگ ودو، انسانیت کی قدر، سماجی و تہذیبی اقدار کی پامالی، تہذیبی روایات سے بغاوت، اکیسویں صدی کے انسان کی داخلی منافقت اور دیگر مسائل زمانہ کو اپنے موضوعات کا حصہ بنایا یہی فکری رو زاہدہ حنا کے افسانوں میں برق رفتاری سے دوڑتی دکھائی دیتی ہے۔ جدید انسان نے اپنی ساری دانش و حکمت کے باوجود ابھی تک پیٹ کی آگ اور جنسی بھوک پر قابو نہیں پایا۔

زاہدہ حنا ''رقص بسمل ہے''، ''راہ اجل میں ہے''، ''قیدی سانس لیتا ہے'' میں قاری کی توجہ عالمی سطح پر استعماری قوتوں کے ظالمانہ اقدامات کی طرف مبذول کراتی ہیں۔ وہ اپنے ان افسانوں میں عراق کے تہذیبی شہر بغداد، بصرہ میں امریکی جارحیت، انسانی جانوں کا ضیاع، بارود کی بھٹی میں جلتے بھنتے انسانی جسم، معصوم بچوں کی آہیں، عورتوں کی فریاد اور بزرگوں کی دہائیاں، صدیوں پرانی تہذیبی میراث اور آثارِ قدیمہ کے مٹنے کا غم اس جگر کاوی سے بیان کرتی ہیں کہ قاری کا عہدِ رفتہ کی صداقتوں پر ایمان وایقان مزید پختہ ہو جاتا ہے۔ اپنے بہترین تاریخی شعور کے بل بوتے پر وہ اس کو آتشِ نمرود، حضرت ابراہیمؑ اور جنگِ عظیم دوم میں جاپان پر ڈھائے گئے امریکی سے مظالم جوڑتی ہیں:

> انھوں نے بغداد کو پاپ کارن مشین بنا دیا جس میں وہ عراقیوں کو، بھٹے کے دانوں کی طرح بھون رہے ہیں۔ یہیں کہیں آتشِ نمرود بھی دہکائی گئی تھی لیکن آتش نمرود تو ہر زمانے اور ہر زمین میں دہکائی گئی۔ ہیروشیما اور ناگاساکی، مائی لائی اور تورابورا، بغداد اور بصرہ، آتشِ نمرود کا امریکی ورژن، نمرود نے سارا اہتمام اکیلے ابراہیم کے لیے کیا تھا۔(۱۱)

زاہدہ حنا کا تمثیلاتی اور تلمیحاتی رنگ ان کے فکر و شعور کا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنے وسیع مطالعہ اور تاریخی ذوق کے بل بوتے پر کئی تاریخی واقعات اور انسانی بے حسی کے مختلف ادوار کو الفاظ کے تاج محل میں سجا دیتی ہیں۔ انھوں نے اکیسویں صدی کے انسانی رویوں کو بڑی فنی پختگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں زندگی کے تمام حقائق اپنی سچائیاں اُگل دیتے ہیں۔ زاہدہ حنا اپنے افسانوں میں انسانی روح کو اضطراب پرور صورت میں اداسیوں کا رنگ دے کر احسن طریقے سے پیش کرتی ہیں۔ اس میں ان کے

ہاں انسانی فطرت کے مختلف رنگ، کہیں تضادات کی شکل میں تو کہیں نفرت کی صورت میں ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کئی افسانوں میں عصر حاضر کے انسان کے نفسیاتی مسائل اور سماجی خلفشار کی جانب اشارہ کیا ہے۔ان کے افسانوں میں ہند اسلامی سماج کے تمام پہلو، کرب اور تنہائی، جبر و تشدد کے کئی رنگ، جنگی مناظر اور تاریخی حقائق ایک فطری سوز و گداز کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

زاہدہ حنا کے افسانوں میں موت کی بازگشت اور زندگی کے مختلف سماجی رنگ چار سو اپنا عکس بکھیرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تلخ و شیریں حقائق زمانہ، عروج و زوال اور ملک گیری کی ہوس، ان کی کہانیوں کے خاص موضوعات ہیں۔ انھوں نے ''نیند کا زرد لباس'' میں بچے کی معصومیت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر پلتی نفرت و بغاوت، ترقی پذیر ممالک پر ڈھائے جانے والے مظالم، بین الاقوامی ناانصافی اور اس کے تیسری دنیا کے ممالک پر پڑنے والے مضر اثرات کو بہ خوبی پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں امریکی جارحیت عراق اور خاص کر افغانستان پر ڈھایا جانے والا ستم دیکھیے:

> میری بہن پروانہ اور میرا بھائی جلال اس بم باری میں مارے گئے۔آپ نے میرے بھائی بہن چھینے، میرا شہر، میرا گھر، میری گلیاں، میرا بچپن، میرے خواب چھینے، آپ نے میری ہتھیلی بھی چھین لی۔آپ کے بھیجے ہوئے جہاز جب ہمارے لیے بسکٹ کے پیکٹ، مکھن کی ٹکیاں اور رنگ رنگ کی تتلیاں گرا رہے تھے تو میں اور میری کئی سہیلیاں ان تتلیوں کو اُٹھانے کے لیے بھاگیں بسکٹ کے پیکٹ اور مکھن کی ٹکیاں اُٹھانے والے بچ گئے۔(۱۲)

اس اقتباس سے ظاہر ہے مصنف نے کس فنی چابک دستی سے عصر حاضر میں انسانی بے حسی کی تصویر کشی کی ہے۔ جاہ و ثروت اور طاقت کے نشے میں چور ترقی یافتہ ممالک کیسے ترقی پذیر ممالک کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ان کا بنیادی مقصد وہاں کی تہذیب، سماجی اقدار و روایات اور تمدن کو برباد کرنا اور وہاں پر موجود معدنیات اور دیگر تنصیبات و نوادرات پر قبضہ جمانا ہے۔

شاہین کاظمی عصرِ حاضر کے افسانہ نگاروں میں اُبھرتا ہوا اک نیا نام ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ **برف کی عورت** چونکا دینے والا ہے۔ انھوں نے سماجی زندگی کے ہر پہلو کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ اپنے ہر افسانے میں حیرتوں کا اک نیا در کھول کر قاری کو چونکا دیتی ہیں۔ کہانی کی بہترین بُنت، گہرے

مشاہدے اور اپنے وسیع کائناتی مطالعہ کے ذریعے وہ جیتے جاگتے سانس لیتے اور سماج میں متحرک کرداروں کو اپنے افسانے کا حصہ بناتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کرب ان کی انگلی تھامے زمان و مکاں کے گھمبیر مسائل کے حیرت سرا میں داخل ہو رہا ہے۔ ان کے الفاظ گونگے بہرے نہیں بل کہ بولتی چالتی چلتی پھرتی تصاویر لگتے ہیں، ان کے بعض افسانوں مثلاً برف کی عورت، برزخ، آخری پنکھ، سیندھ، نرتکی، پتی ورتا اور کھیپ میں عصری و سماجی شعور اور آفاقی دُکھ کسی قدیم مزار پر موجود پرانے برگد کے درخت پر لٹکے رنگ بہ رنگ دھاگوں کی طرح الجھا ہوا انسانی روح کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

شاہین کاظمی نے عصر حاضر کے سماج میں مروجہ اور خود ساختہ روایات کی اونچی دیواروں تلے سسکتی زندگی، اس کی کرم خوردہ اقدار، مذہبی تعصب، خود پسندی، بے حسی، محرومیوں میں بسر ہوتے شب و روز اور جاہ و ثروت میں پلتی جھوٹی انا، انسانی عقائد اور دیگر منہدم ہوتی تہذیبی اقدار و روایات اور مسائل حیات کو بڑی دیدہ دلیری سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ یقیناً ان افسانوں میں ان کی قوت متخیلہ اور فنی مہارت کی داد دینا پڑے گی۔ انھوں نے نسوانیت کا سہارا لے کر اک عورت کے جذبات واحساسات کو جس شدت اور گہرائی سے پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سلمان باسط ان کے مطمح نظر کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

> خود ساختہ روایات کی دیواریں کتنی ہی خستہ کیوں نہ ہو جائیں، ان کے سائے تلے عمریں گزار دینے والے ان کو منہدم کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے معاشرے کی کہنہ اور کرم خوردہ اقدار جانے کتنی بتولوں کی زندگیاں نگل گئی ہیں۔ ایسی فنکارانہ نفاست سے مذہب، عقیدے اور جھوٹی انا کے نام پر ڈھائے گئے ظلم کو بیان کرنا اور پھر اس بیانیے میں اتنا درد سمو دینا کہ قاری کی رگوں کا خون نچڑنے لگے آسان نہیں۔(۱۳)

یہی وجہ ہے کہ شاہین کاظمی کے افسانوں کو پڑھ کر منٹو اور عصمت چغتائی کا عہدِ رفتہ یاد آجاتا ہے۔ وہ سماج کی رومان انگیز مسرتوں اور بھول بھلیوں میں بھٹکتی نہیں بل کہ شاخِ گل پر پھوٹے کومل شگوفوں کی طرح قاری کی بے قرار روح کو تسکینِ جاں عطا کرتی ہیں۔ ان کے ہاں کرب میں ملبوس زندگی کے نقوش کہیں بھی دھندلے نہیں پڑتے بل کہ انفرادی سطح سے اُٹھ کر آفاقی المیوں کی صورت اختیار کر

جاتے ہیں جس میں رشتوں کا الجھتا ریشم بھی ہے اور ناآسودگی کا دُکھ بھی۔ وہ انسانی روح کے اندر اتری بے حسی کی گہری دھند سے اپنے الفاظ کے لیے عطر کشید کرتی ہیں۔

انسان نے جب سے روحانیت پر مادیت پرستی کو ترجیح دی ہے تب سے اس کا اخلاقی زوال شروع ہوا۔ وہ اپنے رویوں اور سماجی زندگی کے اُصول وآدرش کی بنا پر پہچانا جاتا ہے۔ مگر اس کے اندر احساسِ انسانیت ہی نہیں، صرف بے حسی اور خود غرضی کا احساس جاگزیں ہے تو کیا فائدہ ایسی زندگی کا **سیندھ** کا موضوع جعلی پیر پرستی اور محبت وہوس کے روپ میں پلتی ہوئی بے چین روح ہے۔ مذہب کے نام پر لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنا، مزاروں پر مجاور بن کر بیٹھنا، یہ سب برّصغیر کے خود ساختہ خانقاہی نظام کے عیوب کو ظاہر کرتے ہیں۔ مراد شاہ، دلدار شاہ، رجو، زہرا اور ماں اس افسانے کے اہم کردار ہیں۔

وہ اس افسانے میں نام نہاد سماج کی انا پرستی کی بھینٹ چڑھتی معصوم کلیاں، بڑی عمر کے افراد سے بیاہ دیا جانا، خانقاہی نظام میں مذہبی دہشت گردی کا بڑھتا رجحان، ان کی اس خود ساختہ ریاست میں عتاب کا نشانہ بنتے لوگ، سادہ لوح لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنے والے جعلی پیروں کی کارستانیاں اور حرام وحلال کا فلسفہ بھی زیر بحث لائی ہیں۔ زہرا کا کردار ایک مجبور اور بے بس لڑکی کا کردار ہے جو اپنے ارمانوں کا خون ہوتے دیکھ رہی ہے مگر والدین کی ہٹ دھرمی کے آگے بے بس ہے۔ ان کے افسانے دیہات کی عکاسی، مذہبی شعور، سادگی اور خوشیوں سے بھرپور زندگی متوسط طبقے کے مسائل، قسمت کا لکھا کبھی نہیں ٹلتا جیسے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ''سیندھ'' میں رجو کا کردار بہ نسبت زہرا کے انتہائی متحرک نظر آتا ہے۔ اس میں اک عزم ہے۔ وہ حالات کا مقابلہ دیدہ دلیری سے کرتی ہے مگر زہرا کے اندر ایک طرح کی بے بسی نظر آتی ہے بالآخر وہ کھوکھلے اور نام نہاد سماج کے آگے ہار جاتی ہے:

> رجو نے ملیح رخساروں سے نچڑتا لہو اور لبوں کی لرزش بھانپ لی۔ جب لمبی مخروطی انگلیوں کی پوروں میں موت کی سی ٹھنڈک اتری تو وہ بنا کہے پاس پڑا چنبیلی کے پھولوں والا تیل ہتھیلی پر انڈیل کر زہرا کے لمبے بال کھولنے لگی۔ اس کی انگلیاں بہت ملائمت سے گھنے بالوں میں ڈوب ابھر رہی تھیں۔ کسّی ہوئی سانولی رنگت والی بھری بھری کلائیوں میں پڑی سستی کانچ کی چوڑیوں نے ستار چھیڑ دیا۔(۱۴)

افسانے میں منظر کشی یہاں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے کردار ''رجو'' کے ذریعے سماج کے ایسے چہرے بے نقاب کیے ہیں جو اسے آہستہ آہستہ دیمک کی طرح کھا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے متوسط طبقے پر امرا کے ظلم و ستم اور ان دیکھے اعمال کا پردہ فاش کیا ہے۔ ملازمہ ''رجو'' کا کردار برصغیر میں سیاسی اور سماجی زندگی کا ایک طرف خوب صورت منظر نامہ پیش کرتا ہے تو دوسری طرف اس کا اپنی مالکن سے والہانہ لگاؤ اور فطری محبت کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ بغیر کسی خوف کے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتی ہے، اگرچہ اسے علم ہے کہ اس کے اس رویے پر اس کی جان بھی جا سکتی ہے مگر وہ پروا نہیں کرتی۔ اونچی فصیلوں میں سسکتی زندگی کی یہ داستان جس میں عورت کی مجبوری اور مرد کی بے حسی چھپی ہوئی ہے ہماری نام نہاد معاشرت کے گال پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔ لوگ جوان لڑکیوں کو شادی جیسے سماجی بندھن کے نام پر بغیر ان کی مرضی کے بلی چڑھا دیتے ہیں۔ یہ کیسا انصاف ہے وہ اپنا نصیب نہیں لکھ سکتیں یہ حق بھی والدین کو حاصل ہے اسے اپنے گھر میں بھی آزادی سے سانس لینا نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی گروی رکھی زندگی اور حسن و شباب میں وہ رنگینی نہیں ہے۔ اس کا اپنا مستقل گھر نہیں ہوتا۔ آج نہیں تو کل اسے جانا ہو گا:

> جب سے مراد شاہ کی نظر زہرا پر ٹکی تھی گرمیوں کی اس بھری راتوں میں موتیے اور جنگلی گھاس کی مہک لیے ہوا کے نرم جھونکے جیسی زہرا مرجھا گئی تھی۔ اس موئے نامراد شاہ کو شرم بھی نہ آئی حویلی کا رُخ کرتے ہوئے ایک زنانی تو ہنڈا چکا..... ایسوں کو تو موت بھی نہیں آتی۔ (۱۵)

بھیگتی آنکھوں میں لرزتی حیرت، لبوں کی لرزش اور ملیح رخساروں سے نچڑتا لہو، اس کی سنگین اور غم زدہ زندگی کا شاخسانہ تھا۔ ایک دل جس میں ارمان زہریلے ناگ بن کر اس کے پورے وجود میں پھیل کر اسے ڈس رہے ہیں مگر صبر اور اپنوں کی عزت کے سوا اس کے پیش نظر اور کچھ نہ تھا۔

زہرا بہ خوبی جانتی تھی کہ رات گئے اس کے بابا کے کمرے سے کون نکلا تھا۔ وہ مائی جی کے اندر بے بس اور روز مرتی عورت کو جگانا چاہتی ہے۔ اس کے لیے کس مپرسی اور بے وفائی کا دُکھ جان لیوا تھا۔ ان کی پُرنم آنکھوں کے ساون کا رُخ ہمیشہ اندر کی طرف رہا۔ عورت چار دیواری میں قید سونے کی چڑیا ہے۔ آزادی اسے نصیب نہیں۔ اس کے حقوق بھی پامال ہوتے رہے۔ چڑیا کے پر کٹ گئے۔ جوانی گزر گئی

زہرا کے بہ ضد ہونے پر مائی جی کا کہنا تھا: ''اللہ رسول کے نام پر کیے گئے گناہ کی لذت بڑی وکھری ہوتی ہے ایک دفعہ سواد منہ کو لگ جائے تو بندہ حلال کھانے کے لائق نہیں رہتا''(۱۶) وہ اپنے اندر چھپی تلخی کو نہ چھپا سکی۔ خود تو انھوں نے جیسے تیسے دل کے ارمانوں کے تپتے صحرا میں بے وفائی اور پیار کی پیاسی دھرتی پر سسک سسک کر زندگی گزار دی تھی مگر اب وہ زہرا کو اس آگ میں نہیں جھونکنا چاہتی تھی:

> ماں جی غصے سے بولیں اور ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کو کہا لیکن اندر سلگنے لگا تھا۔ بے آواز چیخیں سینے میں دھواں بھرنے لگیں۔ مراد شاہ مردوں کے کس قبیل سے ہے یہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں، اس کے نزدیک عورت نسل بڑھانے کی مشین کے علاوہ کچھ نہ تھی لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھیں کہ زہرا کے باپ دلدار شاہ کے گلے میں پھنسی ہڈی نکالنا مشکل ہے۔(۱۷)

ماں جی کی بارہا کوشش کے باوجود دلدار شاہ نہ مانا اور زہرا کی شادی مراد شاہ سے کر دی گئی۔

علم کتابوں میں ضرور ملتا ہے مگر زندگی کی صحیح حقیقت انسان مشاہدے کے ذریعے سیکھتا ہے۔ زندگی میں درد اور جبر کی امر بیل بالآخر اس کے وجود کو جکڑ لیتی ہیں۔ اپنے باپ کی عمر کے مرد سے شادی ہونا کہاں کا سماجی انصاف تھا۔ اس ظالم سماج میں اب بھی شعور نہیں آیا۔ یہاں بیوروکریٹ، اسمبلی اور حاکمیت کا لالچ مراد شاہ کی ہوس کو ظاہر کرتا ہے۔ سیاسی مصلحت اور ذاتی مفاد کی خاطر دلدار شاہ نے اپنی جوان بیٹی کی بلی چڑھا دی، اونچے گھرانوں کی کھوکھلی انا پرست زندگی، جھوٹی شان و شوکت اور جور و ستم سے مزین حیات، جس کی مسکراہٹوں اور بھڑکیلے لباس کے پیچھے اک کرب چھپا ہوتا ہے۔ ان اونچی فصیلوں کے پیچھے دم توڑتی انسانیت اور کرب سہتی حسرتیں اپنا وجود کبھی مستحکم نہیں رکھ پاتیں اور ان اونچی دیواروں کے اندر چھپا دُکھ کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ یہ اخلاق، جنت اور دوزخ دلانے کے ٹھیکے دار، دولت کے پجاری، نصیب و شرافت کی دہلیز بھی پار نہیں کر سکتے۔ گدی نشین گھرانوں کی مراعات، مشاغل اور عیش و عشرت میں ڈوبی زندگی کے ارمانوں کی ڈور لمبی ہوتی ہے مگر غربا کی آرزوؤں کی پیاس میں سسکتی اور بلکتی زندگی، روح کی سلوٹوں میں مدہم ہوتی دُکھ کی کرنیں بالآخر خاک نشیں ہو جاتی ہیں۔ عورت کبھی سانجھ برداشت نہیں کرتی مگر زہرا مراد اپنے گھر میں مریدنیوں کے ساتھ حویلی اور

حجرے میں مراد شاہ کی رنگ رلیوں سے واقف تھی اسے ماں کی طرف داری حاصل تھی۔ ساس اور بہو کی ازلی نفرت کو بھی انھوں نے نشانہ تنقید بنایا ہے۔

رجو اک بے کس اور مجبور طبقے کی عکاسی کرتا ہوا کردار ہے۔ رجو کے ساتھ ہونے والی زیادتی برّصغیر کے سماج کی باوقار اشرافیہ، جن سے لوگ دین وادب سیکھتے ہیں، بگڑے ہوئے اس خانقاہی نظام کے منہ پر زوردار تھپڑ ہے جو مذہب کی آڑ میں لوگوں کی عزت تار تار کرتے ہیں۔۔ وہ سیندھ لگانے گئی تھی مگر حجرے میں اپنی عزت کو سیندھ لگوا بیٹھی۔ اس افسانے میں مراد شاہ کا کردار اک زہریلے ناگ کی طرح ہے جس نے اسے ڈس لیا۔ مگر دوسری دفعہ کی کوشش میں رجو نے مراد شاہ کا قصہ ہی ختم کر دیا اور اسے زہر پلا دیا۔ رجو سماج کے باغی افراد کی نمایندہ ہے۔ افسانے کا اختتام انتہائی لرزہ خیز اور ڈرامائی انداز میں ہوا ہے۔ اس دھماکا خیز انداز میں بغاوت کا عنصر نمایاں ہے جس سے منٹو یاد آتے ہیں۔ سماج اور اس کی اقدار، نام نہاد روایات اور رسوم کے خلاف باغی ہونا آسان نہیں اس میں بھی اک کرب چھپا ہے۔

المختصر شاہین کاظمی کے علاوہ دیگر افسانہ نگاروں کے ہاں بھی یہی موضوعات اپنے وسیع تر تناظر میں دکھائی دیتے ہیں۔ عصر حاضر میں اُردو افسانہ اپنے ناآسودہ ماحول، انسانی رگوں میں پھیلے خوف اور اپنے گرد و پیش میں پھیلے درد کو اپنے اندر سمیٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے، مثال کے طور پر تہذیبی و سماجی اقدار و روایات کی پامالی، کھوئے ہوؤں کی کھوج، تہذیبی انتشار، انسان کا اخلاقی زوال، جنسی بھوک، انسانی جارحیت کے بدلے میں پیدا ہونے والی بدامنی، عائلی زندگی کے بدلتے تقاضے اور رجحانات، جنسی بے راہ روی، بے حسی، خود پسندی، انا پرستی، جاہ و ثروت اور جھوٹی شان و شوکت، رشتوں کا الجھتا ریشم، ماضی پرستی، بدلتے لمحوں کا دُکھ، بالادست طبقے کی ہٹ دھرمی، متوسط طبقات کی تباہ حالی، سماجی و سیاسی مصلحتیں، غربت میں سسکتی زندگی، خود شناسی و جہاں شناسی، دہشت گردی، تنہائی کرب، نفسیاتی خلفشار، حقائق زمانہ، نفسیاتی الجھنیں، متغیر ہوتی زندگی کے مسائل، تہذیبی بگاڑ، سماجی رویے، نوجوان نسل کی بے روح حیات، ارمانوں کی آگ میں سلگتی زندگی، دربہ دری کا احساس، سامراجی نظام کی تلخیاں اور جور و ستم، خود ساختہ مذہبی عقائد، پیٹ اور تن ڈھانپنے کی بھوک، احساسِ ذات کا نوحہ، تہذیبی و سماجی رکھ رکھاؤ، پیار کی رم جھم بارش، زندگانی کے تلخ حقائق، خانقاہی نظام کے درپردہ مسائل، جنسی تفریق، مذہبی فسادات،

فطرت کا تحفظ، سماجی اقدار کی شکست وریخت، عالمی تشدد، مذہبی دہشت گردی، حب الوطنی، عصر حاضر میں خون آشام زندگی کے مناظر، جذبہ و رومان، ناآسودگی کا دُکھ، محرومیاں، سیاسی اکھاڑ پچھاڑ، ظاہری انارکی، سماجی ناانصافی، بڑھتی ہوئی طبقاتی کش مکش، مذہبی تعصب، معاشی استحصال، جبر واستبداد کے شکنجے میں پستی انسانیت، بے رحم زندگی کے دو پاٹوں میں پاش پاش ہوتے ارمان اور تہذیبی کرب معاصر افسانے کے نمایاں موضوعات ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) زبیر شاہ، ڈاکٹر سید/ آفریدی، محمد عمران، ''اکیسویں صدی کے اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کا تنوع''، مشمولہ مجلّہ نورِ تحقیق، جلد۳، شمارہ۱۰ (لاہور گریریژن یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء)، ص۱۱۶۔

(۲) طاہر نقوی، ''بند لبوں کی چیخ''، مشمولہ: بند لبوں کی چیخ، (کراچی: ادارہ ممتاز مطبوعات، ۱۹۸۲ء)، ص۹۰۔

(۳) ایضاً، ''بند لبوں کا دکھ''، مشمولہ ایضاً، ص۱۰۳، ۱۰۴۔

(۴) عذرا نقوی، ''الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے، مشمولہ: آنگن جب پردیس ہوا (دہلی: ایجوکیشنل ہاؤس، طبع دوم، ۲۰۱۳ء)، ص۴۴۔

(۵) مہتاب عالم پرویز، ریت پر کھنچی ہوئی لکیر (نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۱ء)، ص۲۹۔

(۶) اشتیاق سعید، ''ایک کفن اور''، مشمولہ: ہل جوتا (ممبئی: اعظمی پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص۶۵۔

(۷) اشتیاق سعید، ''بہ رضائے صنم''، مشمولہ: ہل جوتا، (ممبئی: اعظمی پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص۴۸۔

(۸) تحسین بی بی/ناصر آفریدی، ''اکیسویں صدی کے چیلنجز اور زاہدہ حنا کا فن: امکانات و مباحث''، مشمولہ مجلّہ نورِ تحقیق، جلد۳، شمارہ۱۰، (لاہور گریریژن یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء)، ص۳۷۔

(۹) طارق چھتاری، جدید افسانہ (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۲ء)، ص۲۲۳۔

(۱۰) احمد عقیل روبی، ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، مشمولہ زاہدہ حنا، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مرتبہ: آسیہ نازلی، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص۱۶۴۔

(۱۱) زاہد حنا، ''جاگے ہیں خواب میں''، مشمولہ رقص بسمل ہے، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، مارچ ۲۰۱۱ء)، ص۱۶۸- ۱۶۹۔

(۱۲) ایضاً، ''نیند کا زرد لباس''، مشمولہ ایضاً، ص۱۶۰۔

(۱۳) سلمان باسط، ''اک اور طلسم ہوش ربا: مقدمہ''، مشمولہ برف کی عورت از شاہین کاظمی، (اسلام آباد: ایمل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص۱۴۔

(۱۴) شاہین کاظمی، ''سیندھ''، مشمولہ برف کی عورت (اسلام آباد: ایمل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص۲۱۔

(۱۵) ایضاً، ص۲۴۔

(۱۶) ایضاً، ص۲۲۔

(۱۷) ایضاً، ص۲۵۔